بیٹری اور موبائل فون

موبائل فون دور جدید میں ہر انسان کی ضرورت بن گئے ہیں۔ خاص کر سفر میں تو لوگ اس کے بغیر نکلنے کا تصور بھی نہیں کرتے۔ تاہم موبائل فون کی یہ خامی ہے کہ لینڈ فون کے برعکس یہ بیٹری سے چلتا ہے جو کچھ دیر استعمال کے بعد ختم ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اسے چارج کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تاہم اکثر اوقات طویل سفر میں بیٹری کو چارج کرنے کی سہولت نہیں ملتی۔ چنانچہ سفر میں لوگ بہت محتاط ہو کر صرف ضرورت کی جگہ پر موبائل فون کو استعمال کرتے ہیں۔

دنیا کے سفر میں انسانوں کو دی گئی زندگی ایسی ہی ایک بیٹری کے سہارے رواں دواں ہے۔ مگر اس سفر میں بیٹری کو چارج کرنے کی کوئی سہولت نہیں۔ زندگی کی اس بیٹری کو بس ایک دفعہ ہی استعمال ہونا ہے۔ جس کے بعد بیٹری ختم، زندگی ختم۔ بدقسمتی سے موبائل کی بیٹری کو دیکھ بھال کر استعمال کرنے والے انسان اکثر اس حقیقت سے غافل رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کی بیٹری ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ڈسچارج ہو رہی ہے، مگر کسی کو فکر نہیں۔

ہمارے ہاں لوگوں کی اوسط عمر ساٹھ ستر سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے ہم میں سے کسی کی بیٹری پچاس فیصد، کسی کی ساٹھ فیصد کسی کی نوے فیصد ختم ہوچکی ہے، مگر ہم محتاط نہیں ہوتے۔ ہم وقت کو ضائع کرتے رہتے ہیں۔ فضول باتوں، لایعنی مشغلوں، بے فائدہ بحثوں اور بے وقت آرام میں زندگی کی بچی کھچی بیٹری بھی ضائع کرتے جا رہے ہیں۔ جو یہ نہیں کرتے وہ اپنا وقت دنیا کمانے، جائدادیں بڑھانے، مال و اسباب جمع کرنے، شان و شوکت میں اضافے میں ضائع کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسے لوگوں کی مثال اس شخص کی ہے جو دس فیصد بچی ہوئی بیٹری میں اپنے موبائل پر وڈیو گیم کھیلنا شروع کر دے۔

ہم میں سے ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنی بچی ہوئی تھوڑی سی بیٹری پر گیم کھیل رہا ہے یا پھر اسے کسی بامقصد کام میں لگا رہا ہے۔

خدا کا تصور

خدا کے حوالے سے دنیا میں تین تصورات رائج ہیں۔ ایک روایتی طور پر اہل مذہب کا تصور جس میں خدا موجود تو ہے لیکن انسان اس خدا کو صرف یقین کے زور پر پا سکتا ہے۔ اس تصور میں بنیادی خامی یہ ہے کہ اگر معاملہ یقین کا ہے تو صرف خدا ہی نہیں کسی بھی ہستی کو یقین کے زور پر خدا سمجھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مسیحیت میں یقین کے زور پر حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا اور خدائی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

دوسرا تصور موجودہ دور میں رائج انکار خدا کا تصور ہے جس کے مطابق یہ دنیا کسی خدا کی تخلیق نہیں۔ یہ لامحدود طور پر وسیع و عریض کائنات محض بخت و اتفاق کی کارفرمائی سے وجود میں آ گئی ہے۔ مگر اس تصور میں بنیادی خامی یہ ہے کہ یہ کائنات اور ہماری دنیا ہر لمحہ، ہر قدم اور ہر موڑ پر اس کی تردید کرتے ہیں کہ یہ بغیر کسی خالق، کسی خارجی ارادے اور بغیر کسی بنانے والے کے وجود میں آ گئے ہیں۔

خدا کا تیسرا تصور وہ ہے جو قرآن مجید میں ملتا ہے۔ اس تصور کے مطابق خدا پر کوئی یقین کرے نہ کرے، وہ بہرطور خارج میں موجود ایک زندہ حقیقت ہے جس نے انسان اور یہ پوری کائنات بنائی بھی ہے اور اس کا نظام بھی چلا رہا ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے ہونے کا ثبوت ہے۔ تاہم انسانوں کی آزمائش کی بنا پر ایک محدود وقت کے لیے اس نے خود کو انسانوں کی نظر سے پوشیدہ کر رکھا ہے۔ ایک روز آئے گا جب وہ تمام انسانوں کو جمع کر کے خود ان کا حساب کرے گا۔ انسان اس کے آثار دیکھ کر اس کا یقین کر لیں تو یہی درست راستہ ہے۔

خدا کا یہی تصور عین عقلی اور فطری ہے۔ یہی حقیقت پسندی ہے۔ جو لوگ اس سے ہٹ کر جیتے ہیں ان کے حصے میں سوائے ندامت اور ذلت کے کچھ نہیں آئے گا۔

جدل کی نفسیات

قرآن کریم میں انسانوں کی ایک صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ انسان بہت جھگڑالو واقع ہوا ہے،(بنی اسرائیل:54)۔سیاق کلام سے یہ بات واضح ہے کہ یہاں کفار زیر بحث ہیں جو کوئی بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔انھیں ہدایت اور صحیح بات سے کوئی دلچسپی نہیں۔اس لیے وہ ہدایت کی بات سن کر اسے ہنسی مذاق یا بحث مباحثے کا موضوع بنا لیتے ہیں۔

بدقسمتی سے یہ انسانوں کی بہت بڑی کمزوری ہے کہ کوئی بات اگر ان کے تعصّبات کے خلاف ہو تو وہ کسی پہلو سے بھی اس پر غور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔سمجھانے والا دس پہلوؤں سے بات سمجھائے مگر ہر پہلو کے جواب میں نت نئے نکتے نکال کر بات کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔مثلاً آج کے کسی مسلمان کو جو غیر اللہ سے مدد مانگنے کو درست سمجھتا ہو آپ اس کے نقطہ نظر کے خلاف قرآن کی کچھ آیات سنائیں تو وہ جواب میں کہے گا کہ کیا تم اپنے ابا سے مشکل میں مدد نہیں مانگتے یا اپنے باس سے تنخواہ نہیں مانگتے۔اسی طرح کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ کسی مسلمان کو کافر یا دشمنوں کا ایجنٹ ثابت کر کے قتل کرنا جائز ہے۔انھیں جان کی حرمت پر قرآن و حدیث کتنا ہی سنایا جائے وہ جواب میں ایک غیر متعلق واقعہ سنا دیں گے۔

ایسا نہیں ہے کہ ان لایعنی اور غیر متعلق باتوں کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔مسئلہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ یہ طے کر چکے ہوتے ہیں کہ انھوں نے سنجیدگی سے کوئی بات سننی ہی نہیں۔بات کو سنتے وقت ان کا ذہن جواب سوچ رہا ہوتا ہے۔دلیل کو سمجھنے اور اس کی اہمیت کو ماننے کی بجائے وہ اپنی خواہشات کے مطابق ایک بے معنی جملہ بولنا کافی سمجھتے ہیں۔یہ جدل باطل ہے۔یہ حق پرستی نہیں باطل پرستی ہے۔حق پرست انسان ہمیشہ سوچتا اور غور کرتا ہے۔وہ دلیل کے وزن کو محسوس کر کے اعتراف کر لیتا ہے۔جبکہ جھگڑالو انسان کبھی نکتہ آفرینی سے باز نہیں آتا۔یہاں تک کے اللہ کی فیصلہ کن پکڑ کا وقت آجاتا ہے۔

اس کو کچھ میری خبر ہے کہ نہیں

پچھلے دنوں ایک دوست تشریف لائے۔اپنے مسائل کا تذکرہ کر کے کچھ آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے انھیں تسلی دی۔اللہ کی بارگاہ میں مسلسل دعا کرنے کی تلقین کی۔پھر انھیں سمجھایا کہ اللہ کی بارگاہ میں اپنا مسئلہ پیش کر کے صبر سے کام لیجیے اور پھر دیکھیے کہ اللہ کیا کرتا ہے۔اپنی بات سمجھانے کے لیے میں نے ان کی خدمت میں ایک شعر پڑھا۔

میری آہوں میں اثر ہے کہ نہیں دیکھ تو لوں
اس کو کچھ میری خبر ہے کہ نہیں دیکھ تو لوں

اس شعر میں جو درد ہے وہ اسے محسوس کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔میں نے انھیں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ دو لوگوں کی دعا رد نہیں کرتے۔ایک وہ جو اللہ کا مخلص خادم ہو۔اپنے تعصّبات اور خواہشات سے بلند ہو کر بندگی اور خدمت دین کی راہ پر گامزن ہو۔جس کی زندگی کا مرکزی خیال صرف اور صرف اللہ کی ذات ہو۔ایسا شخص جب مسائل میں گھر جاتا ہے۔شیطان اور اس کے ایجنٹ اس کی زندگی اس پر مشکل کر دیتے ہیں۔راہ خدا میں وہ ستایا جا رہا ہو۔پھر وہ تڑپ کر اللہ کا نام لیتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسوں گرتے ہیں تو اس کی آہ سیدھی عرش الٰہی تک جا پہنچتی ہے۔لمحہ گزرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اللہ فیصلہ سنا دیتے ہیں، گرچہ اس فیصلے کے نفاذ میں کچھ وقت لگتا ہے۔

دوسرا شخص وہ ہے جس نے خدا کے قادر مطلق ہونے اور اس کے مقابلے میں اپنے عاجز مطلق ہونے کو دریافت کر لیا ہو۔وہ خدا کی عظمت کو جانتا ہو۔اس کی بڑائی کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہو۔اور ساتھ میں اپنی بے کسی پر لاچار ہو چکا ہو۔مشکلات نے اس کا گھر دیکھ لیا ہو۔ہر بلا آسمان سے اتر کر اس کے گھر کا پتہ پوچھتی ہوئی سیدھی اسی کے ہاں آتی ہو۔اور آنے کے بعد

جانے کا نام نہیں لیتی ہو۔ اسے لوگوں کے ظلم وستم اور انسانوں کی طرف سے محروم کیے جانے کا سامنا کرنا پڑتا ہو۔ ایسا شخص جب تڑپ کر خدا کو پکارتا ہے۔ اس کے دل سے جب آہ نکلتی ہو۔ جب بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسوں نکلتے ہوں۔ جب وہ اپنا سر خدا کے قدموں میں رکھ کر رو رہا ہو۔ اپنی خطاؤں پر نادم ہو۔ اس خوف میں ہو کہ کہیں حالات کی یہ سختی اس کے گناہوں کو نتیجہ نہ ہو۔

اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی بدلنے کے لیے تیار ہو۔ نافرمانی کی ہر پگڈنڈی کو چھوڑ کر صراط مستقیم پر چلنے کا عزم رکھتا ہو۔ اس عزم کے ساتھ اب خدا کی مدد کا طلبگار ہو۔ ایسے شخص کی پکار، اس کی آہ، اس کی فریاد، اس کی تڑپ خداوند دوعالم کی بارگاہ تک فوراً جا پہنچتی ہے......اس کی بات سنی جاتی ہے......اس کی درخواست مانی جاتی ہے۔ عرش اٹھانے والوں کو فوراً حکم ملتا ہے۔ وہ اس حکم کو آسمان والوں تک منتقل کرتے ہیں۔ آسمان والے فوراً اس حکم الٰہی کو زمین والوں تک منتقل کرتے ہیں۔ زمین کے فرشتے اس حکم پر بلا تاخیر عمل کرتے ہیں۔

لیکن یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے اس لیے اس حکم کے ساتھ وقت لکھ کر بھیجا جاتا ہے۔ فیصلہ کے ساتھ اس کے نفاذ کی گھڑی بھی متعین کی جاتی ہے۔ یہ وقت اور یہ گھڑی اکثر کچھ تاخیر سے آتی ہے۔ یہ اگر فوراً آجائے تو پھر امتحان ختم ہو جائے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ دعا کا جواب ہمیشہ دیتے ہیں۔ ہمیشہ بندے کی بھلائی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مگر وقت موخر کر دیتے ہیں۔ مانگی گئی چیز میں شر ہو تو اس کی جگہ بہتر چیز دیتے ہیں۔ بندے کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا بندے کے حال سے کبھی بے خبر نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں سنتا ہے۔ وہ ہر حال میں بندوں کے ساتھ بھلائی ہی کرتا ہے۔ بندوں کو اسے پکارتے رہنا چاہیے۔ اپنی اصلاح کرتے رہنا چاہیے۔ صبر سے کام لینا چاہیے۔ یہ طے ہے کہ اس کے بعد زندگی میں خیر اور بھلائی آئے گی اور پریشانیاں اور مسائل دور ہو جائیں گے۔

اصول پسند کیسے بنیں

سورج زمین سے تقریباً نو کروڑ میل دور ہے۔ اگر یہ فاصلہ کچھ کم یا زیادہ ہو جائے تو کرہ ارض سے زندگی ختم ہو جائے گی۔ مگر سورج کو اس کے رب نے ایک اصول کا پابند کر دیا ہے جس کے خلاف وہ کبھی نہیں کرتا۔ یہی کائنات کی ہر چیز کا معاملہ ہے کہ وہ مقرر کردہ اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ سوائے انسان کے جن کو آزاد پیدا کیا گیا ہے اور مطالبہ یہ ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے اصولوں کی پابندی کریں۔ جب انسان یہ کرتے ہیں تو معاشرہ چین وامن سے بھر جاتا ہے اور جب نہیں کرتے تو بدامنی اور فساد پیدا ہوتا ہے۔

تاہم اپنی مرضی سے اصول پسند ہونا بہت مشکل کام ہے۔ یہ اپنے مفاد، جذبات اور آسانی کے خلاف عمل کرنے کا نام ہے۔ وقت پر نماز پڑھنا، دشمنی کے باوجود کسی کے بارے میں عدل کی بات کرنا، حرام کمائی کے آسان مواقع چھوڑ کر حلال کی تنگی میں گزارا کرنا کسی کو پسند نہیں ہوسکتا۔ یہی معاملہ ان اصولوں کا ہے جو بظاہر غیر مذہبی ہیں۔ چنانچہ ٹریفک کی سرخ بتی پر رکنا ہو یا قطار بنا کر اپنی باری کا انتظار کرنا، ہم لوگ یہ چیزیں پسند نہیں کرتے۔

یہ درحقیقت معاشرے کی لیڈر شپ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اصولوں کے معاملے لوگوں کی تربیت کریں۔ وہ ان کو بتائیں کہ اگر اصول توڑے جائیں گے تو بظاہر کچھ فائدہ، کچھ آسانی اور جذبات کی کچھ تسکین ہو جائے گی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ پورا معاشرہ تباہ وبرباد ہو جائے گا۔ جس سے سب کا نقصان ہوگا۔

مثلاً ٹریفک کے حادثات کا بنیادی سبب قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ لوگ یہ طے کر لیں کہ کوئی شخص ٹریفک کے اصولوں اور قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرے گا تو ننانوے فیصد حادثات ختم ہو جائیں گے۔ تاہم لوگ ایسا نہیں کرتے اور ٹریفک ہی نہیں بلکہ ہر اس اصول اور قانون کو

توڑتے ہیں جس سے ذرا بھی وقتی فائدہ حاصل ہو۔

اس حوالے سے کرنے کا کام یہ ہے کہ ایک عام آدمی کے دل میں اصولوں کی محبت پیدا کی جائے۔ اسے بتایا جائے کہ اصول پسند آدمی اللہ کی نظر میں بہترین انسان ہوتا ہے۔ وہ اپنی اصول پسندی کی بنیاد پر ساری زندگی تہجد پڑھنے والوں اور ساری زندگی روزہ رکھنے والوں سے زیادہ عزت والا ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد لوگوں کے دلوں میں اصولوں کی محبت پیدا ہوگی۔ ان کو اصول کی پیروی کرکے مزہ آنے لگے گا۔ جب سب لوگ سگنل توڑ رہے ہوں گے وہ اطمینان کے ساتھ سرخ اشارے پر کھڑے رہیں گے۔ جب سب لوگ اپنے مفادات کے لیے جھوٹ بول رہے ہوں گے تو وہ سچ بولیں گے اور اگر کوئی نقصان ہو بھی جائے تو اس کو بھی انجوائے کریں گے۔ کیونکہ یہ نقصان ان کو جہنم کے نقصان سے بچالے گا۔

اصول پسندی کا اصل راز اصولوں کو انجوائے کرنا ہے۔ ایسے آدمی کا چاہے کوئی نقصان ہوجائے تب بھی وہ دل میں بہت پرسکون ہوتا ہے۔ ایسا آدمی چاہے کوئی فائدہ حاصل کرنے سے محروم ہوجائے۔ تب بھی وہ اصول پسندی کو انجوائے کرکے زیادہ بڑا فائدہ اور زیادہ بڑی خوشی حاصل کرلیتا ہے۔

آیئے آج سے ہم اصول پسند بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اصول پسندی کو انجوائے کرتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی نفع رہ جائے یا نقصان ہوجائے، ہم کبھی اصول کے خلاف نہیں جائیں گے۔ اس کا نتیجہ آخرت میں تو بلاشبہ جنت میں اعلیٰ مقام ہے مگر اس دنیا میں بھی ذہنی سکون کی وہ دولت ہے جو لاکھوں روپے کما کر بھی نہیں مل سکتی۔ اس کا دوسرا دنیوی نتیجہ ان بیماریوں سے بچ جانا ہے جو لاحق ہوجائیں تو زندگی کا لطف غارت ہوجاتا ہے۔

بیوہ کی عدت

قرآن مجید میں طلاق یا شوہر کی وفات کے بعد خواتین کو عدت پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عدت پوری کرنے کے بعد خواتین دوسری شادی کرسکتی ہیں۔ عدت کی مدت سے قبل وہ دوسری شادی نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ عدت کا اصل مقصد ہی یہ معلوم کرنا ہے کہ خواتین حمل سے تو نہیں۔ وہ فوراً دوسری شادی کرلے تو بچے کے نسب کا مسئلہ ہوجائے گا۔ یہی سبب ہے کہ جس خاتون کا نکاح ہوا اور تعلق زن وشو قائم نہ ہوا ہو اس پر کوئی عدت نہیں، (الاحزاب 49:33)۔ اس لیے کہ نہ میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوا نہ حمل کا امکان ہے اور نہ عدت کا مطالبہ کیا گیا۔

مطلقہ کی عدت تین حیض ہے اور چونکہ اصل مقصد عورت کے پیٹ کا حال جاننا ہے اس لیے مرد کو یہ حکم ہے کہ وہ ایک ایسے طہر میں طلاق دے جس میں تعلق زن وشو نہ قائم ہوا ہو۔ اس کے بعد تین حیض سے یہ بات یقینی ہوجاتی ہے کہ یہ خاتون حمل سے نہیں۔ شوہر کی وفات کی صورت میں چونکہ ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی اس لیے بیوہ کی عدت ذرا بڑھا کر چار ماہ دس دن کردی گئی ہے تاکہ تین حیض سے قبل تعلق قائم بھی ہوا ہو تب بھی مزید سوا مہینے سے معاملہ اور واضح ہوجائے۔ عورت اگر حاملہ ہے تو اسی وجہ سے مدت عدت وضع حمل تک ہوجاتی ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں ایک بیوہ پر اصل پابندی بس یہی ہے کہ عدت کے عرصے میں دوسری شادی نہیں کرے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کے لحاظ میں کہ بیوی شوہر کے گھر ہی عدت گزار رہی ہوتی ہے بیوہ کو تلقین کی ہے وہ سوگ کی کیفیت میں عدت گزارے اور اس عرصے میں کوئی زیب وزینت نہ کرے۔ ارشاد نبوی ہے:

''بیوہ عورت رنگین کپڑے نہیں پہنے گی، نہ زرد نہ گیرو (سرخ مٹی) سے رنگے ہوئے۔ وہ زیورات استعمال نہیں کرے گی۔ اور نہ مہندی سرمہ لگائے گی۔''، (ابوداؤد، رقم 2304)

ایک بیوہ پر قرآن وحدیث میں دین کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں اتنی ہی ہیں۔مگر بدقسمتی سے ہمارے فقہا کے ہاں بیوہ پر ایک اور پابندی اکثر بیان کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اس عرصے میں بیوہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ہم کوشش کے باوجود قرآن وسنت اور حدیث میں اس حکم کا کوئی ماخذ تلاش نہیں کر سکے۔زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ پابندی مرحوم شوہر کے نسب کو محفوظ کرنے کے لیے لگائی جاتی ہے کہ اس عرصے میں بیوہ کہیں ناجائز تعلق قائم کر کے شوہر کے سر کوئی ایسا بچہ نہ ڈال دے جو اس کا نہ ہو۔

ہماری ناقص رائے میں اس سوچ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔جس عفیفہ نے یہ ''کارنامہ'' سرانجام دینا ہوگا وہ شوہر کے عین حیات بھی یہ کام کر سکتی ہے۔اس کے لیے اسے شوہر کی موت کا انتظار کرنے اور عدت کے ''سنہری موقع'' کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارا دین اس پہلو سے ہماری جو تربیت کرتا ہے اور اس نے فواحش اور بدکاری کو روکنے کے لیے جو عمومی پابندیاں لگا رکھی ہیں وہ اپنی ذات میں بہت کافی ہیں۔اگر وہ کافی نہیں ہیں تو کوئی اضافی حکم بدکاری کو نہیں روک سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی پابندیوں کے نتیجے میں ایک عام بیوہ بہت سخت مشکلات میں گھر جاتی ہے۔دور جدید میں خواتین کا گھر سے باہر نکلنا اب ایک معمول ہے۔پھر عام طور پر خواتین بڑی عمر میں بیوہ ہوتی ہیں جب وہ شادی کی عمر سے بہت دور نکل چکی ہوتی ہیں اور اس عمر میں اللہ تعالیٰ ان سے اوڑھنی اور دوپٹے کی لازمی پابندی بھی اختیاری بنا دیتے ہیں، (النور 60:24)۔اس بیوہ خاتون کو ہم شریعت کے نام پر گھر میں بند کر دیتے ہیں۔آج کل کی تیز رفتار زندگی میں رشتہ داروں کے پاس وقت نہیں ہوتا کہ بیوہ سے ملنے آئیں۔ایسے میں بیوہ کے کہیں آنے جانے پر پابندی لگانا ایک دکھی عورت کو نظر بندی اور قید تنہائی کی سزا دینے کے مترادف ہے۔

آخری عذاب

ہمارے ہاں جب کبھی بھی کوئی قدرتی آفت آتی ہے تو فوراً ایک بحث چھڑ جاتی ہے کہ یہ عذاب ہے یا نہیں۔ دوسری طرف ایک نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ یہ سرتا سر ایک قدرتی آفت ہے اور ایسی قدرتی آفات دنیا کی ساری قوموں پر ہر زمانے میں آتی رہتی ہیں۔

حال ہی میں کراچی میں شدید گرمی سے جو اموات ہوئیں، ان کے حوالے سے یہ بحث ایک دفعہ پھر سننے اور دیکھنے کو ملی۔اس گرمی میں خبروں کے مطابق ڈیڑھ ہزار کے قریب لوگ انتقال کر گئے۔لیکن درحقیقت مرنے والوں کی اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔کیونکہ خبروں میں صرف ہسپتالوں میں مرنے والوں کی تعداد شائع ہوئی ہے۔گھروں میں مرنے والوں کی تعداد جو ہسپتال نہیں گئے، اس سے کم نہیں۔ مجھے خود ایک گورکن نے بتایا کہ کراچی کے صرف ایک قبرستان میں پچھلے ایک ہفتے میں اس نے چار سو قبریں بنائی ہیں۔جبکہ کراچی میں سو سے اوپر قبرستان ہیں۔

یہ ساری اموات اس سخت گرمی کی لہر سے ہوئیں جو دنیا بھر میں آئی ہے۔یورپ میں بھی کئی مقامات پر چالیس ڈگری سے اوپر گرمی پڑی ہے جو ان کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔مگر وہاں اموات کا تناسب کافی کم ہے۔کیونکہ وہاں نہ لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے نہ بے گھر لوگ اتنی تعداد میں ہیں نہ غربت و بدحالی کا وہ حال ہے جو یہاں ہے۔یہیں سے یہ دوسرا نقطہ اپنا مقدمہ پیش کرتا ہے کہ یہ کوئی مسلمانوں پر آنے والا عذاب نہیں بلکہ دنیا بھر میں پیش آنے والی قدرتی آفت ہے اور جو قوم جتنی بدحال ہے اسے اتنی ہی قیمت چکانی پڑتی ہے۔جبکہ پہلا نقطہ نظر زور و شور سے اپنے موقف پر قائم ہے کہ یہ ہمارے گناہوں کے سبب آنے والا عذاب الٰہی ہے۔

اس حوالے سے درست نقطہ نظر کیا ہے، یہ ہمیں قرآن مجید کی روشنی سے معلوم ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں عذاب، آفات اور فتنوں کی مختلف اقسام بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ آفات ہیں جو لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں، لیکن یہ آفات صرف گناہ گاروں ہی پر نہیں بلکہ نیک و بد سب پر آتی ہیں۔ ان کا مقصد لوگوں کو متنبہ کرنا اور بڑے عذاب کے آنے سے قبل جھنجھوڑنا ہوتا ہے تاکہ لوگ توبہ اور رجوع کریں۔

ہمارے نزدیک موجودہ دور میں آنے والے سیلاب، زلزلے، موسمی شدت اور اسی نوعیت کی دیگر تباہ کاریاں اسی قبیل سے تعلق رکھنے والی آفات ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید کے مطابق یہ آفات ہر نیک و بد پر آتی ہیں اور اس لیے آتی ہیں کہ ان کو جھنجھوڑا جائے۔ جبکہ عذاب الٰہی صرف بدکاروں پر آتا ہے۔ نیک و بد دونوں اس کی لپیٹ میں نہیں آتے۔ یہ مسلمانوں پر ان کے گناہوں کی وجہ سے آنے والا عذاب بھی نہیں۔ گرچہ مسلمانوں کی جب پکڑ ہوتی ہے تو اس میں نیک و بد دونوں زد میں آتے ہیں، مگر مسلمانوں پر ان کی بداعمالیوں کے سبب جس قسم کی گرفت ہوتی ہے اس کی نوعیت جدا ہوتی ہے۔ اس پر میں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنے نئے آنے والے ناول ''آخری جنگ'' میں گفتگو کی ہے۔

چنانچہ ہمارے نزدیک یہ وہی آفات ہیں جن کا اصل مقصد جھنجھوڑنا ہوتا ہے۔ ان کے اثرات نیک وبد دونوں پر ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں ان آفات کے بار بار آنے کا سبب قیامت کے حادثے کا قریب آجانا ہے۔ مگر جدید دنیا کے لوگ قیامت سے بالکل غافل ہیں اور یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ دنیا کا نظام ایسے ہی چلتا رہے گا اس لیے ان قدرتی آفات کے جھٹکوں سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔

یہ تاثر بالکل درست نہیں ہے کہ یہ محض قدرتی آفات ہیں۔ بلاشبہ یہ قدرتی آفات ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ جو قومیں زیادہ تیار ہوتی ہیں ان میں نقصانات قدرے کم ہوتے ہیں۔ مگر ہم

جانتے ہیں کہ اب یہ آفات ایک تواتر سے آنا شروع ہوگئی ہیں۔ بعض اوقات ان کی شدت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی بہت زیادہ نقصانات ہوجاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

یہی وقت ہے کہ مسلمان اپنی ذمہ داری کو پہچانے۔ وہ انسانیت کو قیامت کا انذار کریں۔ اس آخری عذاب کے آنے سے قبل لوگوں کو ہوشیار کردیں جو پوری انسانیت کو ہلاک کردے گا۔ آج انسانیت خدا کے انکار کی مجرم ہوچکی ہے۔ یہ شرک سے بڑا جرم ہے۔ دنیا نے زنا اور ہم جنس پرستی کو عین انسانیت بنا دیا ہے۔ یہ تاریخ انسانی کا بدترین جرم ہے۔ سود آج پوری دنیا کے خمیر میں شامل ہوچکا ہے اور پوری پوری قومیں آج اس کی زنجیروں میں جکڑی جا چکی ہیں۔

یہی وقت ہے کہ عالمی انذار عام شروع کیا جائے۔ یہی وقت ہے کہ سرکار دوعالم کی تعلیمات کو انسانیت کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس لیے کہ اب سب کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ آخری عذاب کا وقت آرہا ہے۔ قیامت کا وقت آرہا ہے۔ جس نے رجوع کرنا ہے وہ کرلے۔ یہی دنیا کو بتانے کا کام ہے۔

ایشیاء کی سواعلیٰ ترین یونیورسٹیوں میں پاکستان موجود نہیں

اگرچہ نام نہاد ریسرچ اور سروے رپورٹیں بھی کمرشل ازم کی وبا کی موجودگی میں ڈگریوں اور ڈپلوموں کی طرح کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں رہیں مگر ''دی ٹائمز ایجوکیشن میگزین'' لندن ایک مثبت شہرت رکھنے والا جریدہ ہے جس کی تازہ ترین ریسرچ اور سروے رپورٹ کے مطابق ایشیا کی سواعلیٰ یونیورسٹیوں میں کوئی ایک بھی پاکستانی یونیورسٹی شامل نہیں ہے جبکہ اس فہرست میں ہندوستان کی نو اور چین کی بیس یونیورسٹیاں شامل ہیں۔

ہندوستان کی انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ ہانگ کانگ، تھائی لینڈ اور تائیوان جیسے چھوٹے ملکوں کی یونیورسٹیوں کو بھی ایشیا کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں کی فہرست میں نمایاں جگہیں ملی ہیں۔

اس افسوسناک صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر شاہد صدیقی نے کہا ہے کہ پاکستان کو اس میدان میں ایشیا کے دوسرے بڑے ملکوں سے پیچھے نہیں ہونا چاہئے مگر اس سلسلے میں بعض وجوہات اور رکاوٹوں کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک نمایاں وجہ تو یہ ہے کہ ہماری دانش گاہوں میں ریسرچ کی جانب کچھ توجہ نہیں دی جارہی۔ سال 1947ء سے 2002ء تک ہماری یونیورسٹیوں میں ریسرچ پر افسوسناک حد تک تھوڑی توجہ دی جاتی رہی ہے۔ سکولوں کی تعلیم میں تو ریسرچ کا نام ونشان ہی نہیں ہے۔ جو روایت سکول سے شروع نہیں ہوگی وہ یونیورسٹی کی تعلیم تک کیسے پہنچے گی۔

وائس چانسلر صدیقی نے کہا کہ ضروری اور لازمی ہے کہ پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ریسرچ کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ریسرچ کی

حوصلہ افزائی کے لیے یونیورسٹیوں کے فنڈز اور گرانٹس میں نمایاں اضافہ کرنا پڑے گا اور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ریسرچ اور تحقیق تعلیم کی بنیادی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہونی چاہیے۔ ٹائمز ایجوکیشن میگزین کی ریسرچ اور سروے رپورٹ میں خاص طور پر علم، تدریس، ریسرچ جیسے 13 بڑے شعبوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایشیا کے سواعلیٰ تعلیمی اداروں کی فہرست تیار کی گئی تھی جس میں جاپان، سنگاپور، ہانگ کانگ، چین اور کوریا کو سرفہرست دس ملکوں میں شامل کیا گیا ہے۔ سرفہرست جاپان کی ٹوکیو یونیورسٹی قرار پائی ہے جبکہ سنگاپور کی نیشنل یونیورسٹی دوسرے نمبر پر ہے اور ہانگ کانگ کی یونیورسٹی کو تیسرا نمبر دیا گیا ہے جبکہ بیجنگ (چین) کی یونیورسٹی چوتھے نمبر پر ہے اور چین ہی کی سیچاؤ (Tsinchua) یونیورسٹی کو پانچواں نمبر دیا گیا ہے۔ جاپان کی تیرہ اور کوریا کی دس یونیورسٹیاں اس فہرست میں موجود ہیں جو اپنے ملکوں اور قوموں کا نام روشن کرنے کی وجہ بن رہی ہیں۔ اسرائیل کی چار اور ایران کی بھی چار یونیورسٹیوں کو اس فہرست میں جگہ حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ سنگاپور، سعودی عرب اور تھائی لینڈ کی دو دو یونیورسٹیاں اس فہرست میں شامل ہیں۔ جبکہ میکاؤ اور لبنان کی ایک ایک یونیورسٹی ایشیا کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں کی فہرست میں موجود ہے۔ اعلیٰ تعلیمی کمیشن پاکستان کے چیئرمین ڈاکٹر مبارک احمد نے خواہش ظاہر کی ہے کہ پاکستان کو بھی اس فہرست میں شامل ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔

ہر مشکل سے نکلنے کا ایک راستہ ضرور ہوتا ہے
اسے ڈھونڈئیے اور اگر نہ ملے تو

فرح رضوان

نافرمان بچوں سے نمٹنے کا طریقہ

کرکٹ میچ کے دوران، بلے باز کے ہیلمٹ سے جب فل سپیڈ میں آتی گیند ٹکراتی، اور اس تصادم سے وہ چکرا کر رہ جاتا ہے تب وہ ہیلمٹ پر غصہ نہیں نکالتا بلکہ اگلے ہی لمحے وہ اپنا ہیلمٹ اتار کر اسے چومتا ہے، جس کی وجہ سے وہ زخمی ہونے سے بچ گیا۔ تو اگر کبھی کسی تیسرے فرد سے اپنے بچے کے متعلق غیر اخلاقی اور ناقابل یقین خبر ملے تو اس مخبر سے جھگڑے اور بحث کے بجائے، اللہ کا شکر کریں کہ بروقت آپ کو علم ہو گیا اب آپ کوئی سدباب کر پائیں گے۔ اور اس خیر خواہی پر اس کا شکریہ ادا کریں۔

بچے سے تصدیق کے دوران آپ کا خون کتنا ہی کھولے اور دل کتنا ہی ڈولے لیکن اپنے الفاظ اور انداز کو بے قابو نہ ہونے دیں۔ اور یہ کلاس اور لیکچرز ایک ہی دن کی تو بات نہیں، لہٰذا جب کبھی شدید غصہ آئے، خود پر قابو پانے میں دقت ہو، تو ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ دانت مضبوط ہوں تب تو بندہ گنا کھا کر یا اخروٹ توڑ کر ان پر زور آزمائی کرے۔ لیکن ! دانت ہی کمزور ہوں، مسوڑھوں سے خون آئے، ٹھنڈا گرم لگے یا ان میں پس پڑ جائے، تب تو لازمی ان کی حفاظت کی خاطر، نرم اور پرہیزی غذا ہی کھانی پڑتی ہے۔

مانا کہ ان حالات میں والدین خود کو بند گلی میں پاتے ہیں جہاں کوئی در کھلتا دکھائی نہیں دیتا۔ اگر آپ کو بھی لگتا ہے کہ زندگی کے سفر میں تاریکی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں تو امید سحر کا دامن نہ چھوڑیں بلکہ راتوں کو اٹھ کر اپنے رب سے ربط بڑھائیں، اور اس سے مدد چاہیں جو ہر بند دروازے کو پلک جھپکتے کھول سکتا ہے۔

اگر آپ واقعی اولاد کو راہ راست پر لانا چاہتے ہیں تو اس پر سختی کرنے کے بجائے خود کو سختی

سے مولڈ کیجیے، یوں جب تلخی دور ہوگی تو فاصلے کم ہوں گے۔ فطری محبت میں جوش نہ سہی کچھ گرمی تو ان شاءاللہ ضرور آئے گی۔ برف پگھلنے کو یہ حرارت بھی بہت کافی ہے، بات کرنے کا موقع ملے تو اچھے وقت کی یادیں دہرائیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر تعریف کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

یعقوب علیہ السلام کو ایک طرف تو چہیتے بیٹے کی جدائی کا غم، کیا کم تھا کہ بیک وقت اپنے ہی دس بیٹوں کے سازشی کردار کو بھی جھیلنا پڑا۔ کیا انہوں نے بچپن سے ان کی بہترین تربیت نہ کی ہو گی؟ لیکن وہ دس کے دس بیک وقت شیطان کے جھانسے میں آ گئے۔ لہٰذا خود کو مجبور سمجھ کر گھٹن کا شکار ہونے کی بھی ہرگز ضرورت نہیں کہ اولاد کے ہاتھوں یہ دن دیکھنے پڑ گئے۔

ذرا آگے پڑھیے تو پتہ چلتا ہے کہ وقت کے نبی کو ان کے وہی دس بیٹے گیارہویں بھائی کو اپنے گھر کے غلے کی کمی پوری کرنے کے لیے لے جانے پر بضد ہیں۔ اور آخرکار بوڑھے باپ کو ان کی خواہش کے سامنے جھکنا پڑ رہا ہے، جو واپس آ کر اپنے ضعیف والد کو یہ اطلاع بھی دے رہے ہیں کہ اس بھائی کو بھی وہ ان کے بارہویں بیٹے کی طرح گنوا بیٹھے ہیں۔ اور اسی پر بس نہیں بلکہ جب یعقوب علیہ السلام، بن یامین کے اس دکھ پر یوسف علیہ السلام کو بھی یاد فرماتے ہیں تو ان دس بیٹوں میں سے کسی ایک نے بھی کیا انہیں تسلی دی؟ گلے لگایا؟ ان سب کے الفاظ و انداز پر ذرا غور تو کریں۔ لیکن دوسری جانب والد کی زبان پر وہی سالوں پرانی بات کہ صبر جمیل کروں گا۔ اور یہ کہ میں اپنے غم و الم کی فریاد اللہ ہی سے کرتا ہوں۔ کسی سے شکوہ نہیں ناامیدی کی کوئی بات نہیں بلکہ اللہ کی رحمت پر کامل یقین کہ بیشک اللہ کی رحمت سے صرف وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔ پھر جب ان بیٹوں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تو جواب میں والد نے کیا کیا؟ انہیں طعنے دیے؟ بددعا دی؟، دھمکیاں دیں یا گھر سے دھکے دیے؟ نہیں بلکہ تسلی دی کہ اللہ کے حضور ان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں گے۔ آخرکار اتنے کٹھن مراحل کو صبر سے طے کرنے کے بعد، کھوئی ہوئی بینائی، بچھڑی ہوئی اولادیں، خیر و منزلت سبھی کچھ نصیب ہوا۔

ابو یحییٰ

اللہ کی محبت کیسے پیدا کی جائے

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے پیدا کی جائے ،(ا،ک)

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت ایک فطری جذبہ ہے جو اس ہستی سے خود بخود ہو جاتی ہے جس کی عنایات، مہربانیاں، شفقتیں، احسانات اور کرم ہم اپنی زندگی میں مسلسل دیکھتے ہیں۔ آپ غور فرمایئے تو والدین، بھائی بہن، دوست احباب سب سے محبت کی بنیادی اساس یہی ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی رشتہ اپنا رویہ ظالمانہ کرلے تو محبت کا تعلق کمزور پڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ یہی طریقہ اللہ سے محبت پیدا کرنے کا ہے۔ اللہ کے احسانات کو ہر دم یاد کرتی رہیں، ہر چیز میں اس کی عنایت کا پہلو دیکھیں۔ محبت خود بخود ہو جائے گی۔

شیطان کی ہمہ دم یہی کوشش ہوتی ہے کہ ہماری نظر کبھی اللہ کی نعمتوں کی طرف نہ رہے بلکہ زندگی میں کوئی ایک آدھ مسئلہ ہو تو وہ اسی مسئلے کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان میں مستقل شکایت کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ شکایت کے ساتھ محبت نہیں ہوسکتی۔ اس لیے مثبت سوچ کی حامل بنیے اور منفی چیزوں کو نظر انداز کر کے اللہ کی نعمتوں کو جو بے شمار ہیں، انھیں ڈھونڈنا اور ان کا شکر ادا کرنا اپنا وظیفہ بنالیں۔

فرشتوں کا اختیار

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرشتے مجبور محض مخلوق ہیں یا یہ بھی اپنا آزادانہ اختیار رکھتے ہیں۔ نیز کیا یہ حکم عدولی کرسکتے ہیں اور اس ضمن میں ان کی آزمائش ہوسکتی ہے جیسے امام امین احسن اصلاحی کی رائے ہے کہ آدم کو سجدہ فرشتوں کا امتحان تھا۔ پ، ع۔

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہمارے علم کے مطابق سزا و جزا کے پہلو سے اس دنیا میں مخلوقات چار حصوں میں تقسیم ہیں۔ دو وہ ہیں جو مکلّف ہیں اور سزا و جزا کے مستحق ہیں۔ یہ جن و انسان ہیں۔ جبکہ دو وہ ہیں جن کا یہ معاملہ نہیں۔ ان میں سے ایک فرشتے ہیں دوسری قسم میں باقی تمام مخلوقات ہیں۔

ان تمام میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں سے کچھ صفات جزوی طور پر اور گویا کہ ان کا ایک عکس رکھ دیا ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

صاحب شعور

علم و شعور کی ایک سطح ہے جو ہر مخلوق میں مختلف ہوسکتی ہے۔ یہ تمام مخلوقات اور ان کے ساتھ فرشتوں، جنوں اور انسانوں کو دیا گیا۔ اس شعور میں وہ سارے وظائف بھی شامل ہیں جو زندگی برقرار رکھنے کے لیے عطا کیے جاتے ہیں۔

صاحب اختیار

یعنی وہ مخلوقات جو اپنے بنیادی وظائف زندگی سے بلند ہو کر ایک ارادہ کرسکتی ہیں۔ چاہیں تو

اللہ کی مرضی ومنشا کے خلاف بھی جاسکتے ہیں۔ان میں فرشتے،جن اورانسان تینوں شامل ہیں۔ باقی مخلوقات ان میں شامل نہیں۔وہ اللہ کے مقررکردہ دائرے سے باہر نکلنے کا اختیار نہیں رکھتیں۔

صاحب امتحان

یعنی وہ لوگ جو حالت امتحان میں ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا حکم معلوم ہونے کے بعد بھی ان کو یہ اختیار ہے کہ چاہیں تو مانیں اور چاہیں تو نہ مانیں۔نافرمانی کی صورت میں ان کو فوراً نہیں پکڑا جاتا بلکہ عام طور پر مہلت دی جاتی ہے۔ان میں جن اور انسان دونوں شامل ہیں۔یہی دو مخلوقات حالت امتحان میں ہیں۔فرشتے صاحب شعور اور صاحب اختیار ہیں،مگر صاحب امتحان نہیں۔وہ اللہ کی حکم عدولی کریں گے تو فوراً پکڑ ہو جائے گی۔

صاحب اقتدار

یہ صرف انسان ہے۔دنیا پر اسی کا اقتدار ہے۔یہی زمین پر خلیفہ ہے۔اس کی مرضی کے آگے کوئی مخلوق نہیں ٹھہر سکتی۔سوائے اس کے کہ اللہ کا فیصلہ کچھ اور ہو۔

یہ ہمارے علم کے مطابق مخلوقات کی اقسام ہیں باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

ابو یحییٰ

حج تمتع کی قربانی

سوال:

السلام وعلیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ،

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ آپ خیریت سے ہوں، سر آج حج تمتع کے حوالے سے سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 196 کے مطابق کیا حج تمتع کی نیت سے

جانے والے کو عمرہ کے بعد قربانی کرنی ہے اور پھر حج کے بعد بھی؟ یعنی حج تمتع کرنے والے کو دو مرتبہ قربانی کرنی ہوتی ہے یا حج پورا ہونے پر ایک بار ہی؟

دعاؤں کی طلب گار راحت عباس

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حج تمتع سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص حج کرنے جائے۔اور اسی سفر میں وہ عمرہ بھی ادا کر لے۔ قرآن مجید ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے مگر ساتھ میں کفارہ کی ایک قربانی کو بھی عاید کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر جو قربانی کی جاتی ہے وہ حج یا بقرہ عید کی نہیں ہوتی بلکہ کفارہ کی قربانی ہوتی ہے۔ یہ قربانی عمرہ کے بعد نہیں بلکہ دس ذوالحجہ کو رمی کے بعد کی جاتی ہے۔ پاکستان سے جانے والے یہی قربانی کرتے ہیں اور اسے حج کی قربانی سمجھتے ہیں۔حالانکہ وہ کفارے کی اس قربانی سے جدا ایک اور قربانی ہے۔اس کا وقت بھی یہی ہے یعنی دس ذوالحجہ کو رمی کے بعد۔مگر یہ نفل قربانی ہے اور لوگ عام طور پر اس سے واقف بھی نہیں ہیں۔اس لیے اسے نہیں کرتے۔تاہم وہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔یہی وہ قربانی ہے جس کا ذکر سیرت طیبہ میں صلح حدیبیہ کے واقع میں ملتا ہے۔ اسے ہدی کہتے ہیں۔

ابو یحییٰ

ہمیں زندگی کے مسائل برے لگتے ہیں مگر بڑی ترقی بڑے مسائل کے بغیر نہیں ملا کرتی (ابو یحییٰ)

ابو یحییٰ

سفر مدینہ

[حج کی آمد آمد ہے۔ خوش نصیب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد حج وعمرہ کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس روانہ ہو رہی ہے۔ اس موقع کی مناسبت سے ابو یحییٰ کے ایک غیر مطبوعہ سفرنامے کے کچھ اجزاء اس ماہ شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ چند برس قبل عمرہ کے سفر میں قیام مدینہ کی کچھ یادداشتیں ہیں جو قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ ادارہ]

بدلا ہوا مدینہ اور بن دیکھے ماننے والے

ہم عشا کے وقت مدینہ پہنچے۔ اذان ہو رہی تھی۔ خواہش تھی کہ حرم پاک میں نماز پڑھ لی جائے۔ مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ ہوٹل بہت معیاری اور شاندار تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کمرے کی کھڑکی سے گنبد خضرا اور پوری مسجد نبوی ہمہ وقت نظر کے سامنے رہتی تھی۔ آج یہ مسجد اس پوری جگہ پر پھیل چکی ہے جو نبی کریم کے زمانے میں یثرب ہوا کرتا تھا۔ جبکہ دوسری سمت سے سکان بقیع کی آبادی کا دیدار ممکن تھا۔ یوں مدینہ اور مدینہ والے دونوں کا دیدار ہمہ وقت ممکن تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ عنایت تھی جس پر ہم پورے قیام کے دوران شکر ادا کرتے رہے۔

ہمارا ہوٹل اسی سمت تھا جہاں دس برس قبل میں عنابیہ اسٹریٹ، اس کے ان گنت ہوٹلوں، کھوے سے کھوا چھلتے ہوئے بازاروں، مختلف قسم کی دکانوں کو چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر اب تو منظر ہی بدل گیا تھا۔ نہ وہ گلیاں رہیں نہ وہ دوکانیں اور رہائش۔ گنتی کے چند بڑے ہوٹلوں، ایک آدھ شاپنگ سنٹر کے سوا سڑک اور چند کھلے قطعات باقی رہ گئے تھے۔ ان قطعات میں بھی جلد یا بدیر ہوٹل بن جانے تھے۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے جب مسجد نبوی کو دیکھنے کے لیے کھڑا ہوتا تو

نیچے بھی نظر پڑ جاتی۔ یہ بڑا اجنبی سا منظر لگتا۔ پھر میں سوچتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے مدینہ سے تو صورتحال قطعاً مختلف ہو چکی ہے۔ آج اسلام کی شاندار عظمت کا جھنڈا چار سو بلند ہے۔ لاکھوں مسلمانوں کی یہاں آمد اور دولت کے بے پناہ خزانوں نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ مکہ اور مدینہ کا نقشہ کچھ سے کچھ ہو چکا ہے۔ اگر یہ منظر ابو جہل، ابولہب، کعب بن اشرف اور عبداللہ ابن ابی دیکھ لیتے تو شائد ان کا رویہ کچھ مختلف ہوتا۔ مگر اسلام کی عظمت کے ظہور کے بعد اسلام قبول کرنے کی وہ حیثیت نہیں رہتی۔ یہ تو خود رسول اللہ کی زندگی میں فیصلہ ہو گیا تھا کہ فتح مکہ سے پہلے اور بعد میں اسلام قبول کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے (حدید 10:57)۔ آج بھی یہی معاملہ ایک دوسرے پہلو سے ہو رہا ہے۔ آج خدا کی عظمت اور اس کی بے مثل جنت غیب کے پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ جس شخص نے اس عظمت کو اس کے ظہور سے قبل دریافت کر کے زندگی توحید و آخرت کے لیے وقف کر دی۔ کل قیامت میں وہ صحابہ کرام کے ساتھ جنت الفردوس کی بستی میں بسایا جائے گا۔ اور جو شخص اپنے اکابرین اور اپنے فرقہ میں جیتا رہا، جس نے دنیا کو مقصد بنایا، اس کے لیے ابدی محرومی کے سوا کچھ نہیں۔

حالات کا ستم

میں مکہ سے جدہ اس حال میں لوٹا تھا کہ شدید ٹھنڈ لگ چکی تھی۔ یہاں مدینہ میں بھی اس کا اثر باقی رہا بلکہ بہت بڑھ گیا۔ دراصل مدینہ میں شدید گرمی تھی۔ اس گرم راستے سے گزر کر مسجد میں پہنچتے تو انتہائی تیز ٹھنڈا اے سی چل رہا ہوتا تھا۔ مکہ میں تو یہ انتخاب موجود ہے کہ اگر آپ غیر ضروری ٹھنڈے اے سی سے بچنا چاہیں تو مطاف اور اس کے ارد گرد کی مسجد میں جائے پناہ میسر ہوتی ہے۔ مسجد نبوی میں ایسے کوئی جائے عافیت نہیں۔ کھلے صحن کو بھی چھتریوں سے ڈھانک کر اس کے ستونوں سے اتنا تیز اے سی چلایا جاتا ہے کہ بیماری کے اثر میں آیا ہوا کوئی شخص اسے

برداشت نہیں کرسکتا۔ مجھ پر بھی اس کا اثر ہوااور میرے ساتھ باقی گھر والے بھی متاثر ہو گئے۔

اس پر مستزاد یہ کہ باہر کے کھانے کھا کھا کر میرا پیٹ خراب ہو چکا تھا۔ ساتھ میں ٹانگوں میں اتنا درد ہو گیا کہ مسجد تک آنا جانا دوبھر ہو گیا۔ دوسری طرف مسجد میں زیادہ تر بیٹھنا تیز اے سی کی وجہ سے ممکن نہ تھا۔ یوں ہر نماز کے لیے پانچ دفعہ ہوٹل سے مسجد چل کر جانا پڑتا تھا۔ کئی اور قسم کی پریشانیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ مجھے دو دن کے بعد محسوس یہ ہونے لگا کہ ہم یہاں مزید نہیں رک سکیں گے جبکہ پروگرام آٹھ دس دن کا بنا کر آئے تھے۔

We need to talk

اللہ تعالیٰ ایک زندہ و جاوید ہستی ہیں۔ زندہ و جاوید کا مطلب کیا ہوتا ہے اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ ہم جس ہوٹل میں تھے وہاں کی انتظامیہ نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ اے سی کو فل اسپیڈ پر سیٹ کر کے اس کا ریموٹ کنٹرول خود رکھ لیتے تھے، کمرے میں نہیں چھوڑتے تھے۔ اس کا سبب غالباً ان کے کچھ تلخ تجربات ہوں گے کہ کوئی ریموٹ ساتھ لے گیا، کسی نے کھو دیا اور کسی نے خراب کر دیا۔ لیکن جب ہمیں مسئلہ ہوا تو ہم نے ان سے کہا کہ اے سی کی رفتار کو کم کیجیے۔ چنانچہ ان کا ایک آدمی ریموٹ لے کر آیا اور ہماری مرضی کے مطابق اسے سیٹ کر کے چلا گیا۔ یہ زندگی اور فعالیت کی ایک مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی کائنات اسی اصول پر بنائی ہے کہ بہت سی چیزیں طے کر کے انھیں اصولوں کے تحت متعین کر دیا ہے۔ ان کا اختیار انسان کی مرضی پر نہیں چھوڑا ہے۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں فساد برپا ہو سکتا ہے۔

تاہم وہ زندہ و جاوید ہیں۔ حی القیوم ہیں۔ وہ معاملات میں مداخلت کرتے ہیں اور انسانوں کے مسائل کو حل کرتے رہتے ہیں۔ اکثر وہ ایسا انسانوں کے علم میں لائے بغیر کرتے ہیں۔ لیکن کبھی وہ اپنی مداخلت کو بندے کی مانگ پر موقوف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ انسان کے

معاملات جب کبھی بگڑنے لگیں تو پہلے انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے اللہ کے کسی اصول کو تو پامال نہیں کیا۔ لیکن جب وہ مضطر و بے بس محسوس کرنے لگے تو اسے پروردگار سے وہی کہنا چاہیے جو ایک اہم گفتگو کے لیے کسی شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جاتا ہے۔ یعنی we need to talk۔ اللہ تعالیٰ سے اس گفتگو کا سب سے موثر وقت تہجد ہوتا ہے۔ جب کوئی بندہ عاجز اس وقت اللہ کے حضور اس کے زندہ جاوید ہونے کا یقین کر کے اس سے مناجات کرتا ہے تو پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ معاملات پرانے رخ پر چلتے رہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ مداخلت کرتے ہیں۔ وہ جیسے کریں یہ ان کی مرضی ہے، لیکن اس کے بعد ناممکن ہے کہ بندے کی دادرسی نہ کی جائے۔

''جوتیاں پھڑا'' اور برادران یوسف

پچھلے زمانے میں گاؤں دیہاتوں کی چوپالوں میں اور بعض جگہوں پر اب بھی گاؤں کے مکھیا اور چوہدریوں کی مجلس جما کرتی۔ لوگوں کے قضیے وہاں طے ہوتے، مسائل سنے جاتے اور لوگوں کو تسلی اور حوصلہ دیا جاتا تھا۔ لیکن کبھی کبھار کوئی ایسا سائل آجاتا جو بات کرنے سے پہلے سر قدموں میں رکھ دیتا اور جس کی درخواست میں اتنی تڑپ یا اس کا مسئلہ اتنا سنگین ہوا کرتا تھا کہ اس کی بات سنتے ہی چوہدری صاحب حقہ کونے میں رکھتے اور ٹانگ دباتے ہوئے ملازم سے یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے کہ اوئے جوتیاں پھڑا۔ پھر ظاہر ہے کہ چوہدری صاحب کی ذاتی اور فوری مداخلت سے یہ مسئلہ حل ہو جایا کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہر تشبیہ اور تمثیل سے بلند ہیں۔ لیکن کوئی سائل اگر ان کے پاس اس طرح آجائے جس طرح یوسف علیہ السلام کے بھائی ان کے پاس آئے تھے تو پھر معاملہ ''جوتیاں پھڑا'' سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ یہ بات تو بہت لوگوں کو معلوم ہوگی کہ حضرت یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں نے کیا کیا تھا۔ مگر یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کے مصر کا بادشاہ بننے کے بعد آخری دفعہ

جب ان کے بھائی ان کے پاس آئے تو انہوں نے ان سے کیا کہا تھا۔ وہ انتہائی بدحال اور دکھی تھے۔ ایک بھائی (یوسف) کو باپ سے دور کردینے کے بعد اپنے ضمیر کے مجرم تھے اور دوسرے (بن یامین) کو دربار مصر میں کھو کر آگئے تھے۔ باپ ناراض اور دکھی تھے۔ زندگی گزارنے کے لیے اناج ختم ہو چکا تھا۔ نقدی بہت کم تھی۔ جو تھی اسے لے کر مصر کے بادشاہ کے دربار میں پہنچے جو دراصل ان کے مظلوم بھائی کا دربار تھا۔ انہوں نے دربار میں بڑی بے کسی سے کہا:

یا ایھا العزیز مسنا واھلنا الضر و جئنا ببضاعة مزجاة فاوف لنا الکیل و تصدق علینا

یعنی اے بادشاہ ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو مصائب نے آلیا ہے۔ ہم اپنی حقیر پونجی لے کر آئے۔ آپ اس کے بدلے میں پورا تول دیجیے اور ہم پر خیرات بھی کیجیے۔ اس عجز کو دیکھ کر حضرت یوسف نے نہ صرف انہیں معاف کیا بلکہ سب لوگوں کو فلسطین سے اپنے پاس مصر بلا کر بڑی عزت سے وہیں آباد کر دیا۔

میں کبھی سوچتا ہوں کہ اگر کوئی بندہ خدا کو اس طرح پکارے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ گاؤں کا چوہدری تو جوتیاں پہن کر مسئلہ حل کرنے نکل پڑے، یوسف علیہ السلام ظالم بھائیوں کو معاف کردیں اور دوسری طرف عالم کا پروردگار سراپا رحمت اور شفقت بندے کی دعا سننے کے بعد بھی بے نیازی کے ساتھ بیٹھا رہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہوسکتا۔

فیضان رب جاری رہا

ہم جمعرات کو مدینہ پہنچے تھے۔ جمعہ کو صبح ناشتہ کرنے نکلے تو معلوم ہوا کہ بھائی صاحب کے پیسے گر گئے۔ اہلیہ نے اطلاع دی کہ ان کے کچھ زیور کھو گئے ہیں۔ اسی افراتفری میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ جمعہ کی نماز سے قبل عرفان بھائی اپنی فیملی سمیت آگئے تھے۔ ہم سب نے بمشکل تمام مسجد سے باہر گرم دھوپ میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ جمعہ پڑھ کر عرفان بھائی اور رضوان بھائی واپس چلے

گئے۔ والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں چنانچہ یہاں ہم چار افراد ہی رہ گئے۔ ایک دو دن مزید مشکل کے گزرے اور اس کے بعد اتوار تک اللہ تعالیٰ نے ہمیں سیٹ کر دیا۔ وائف کا کھویا ہوا زیور مل گیا۔ طبیعتیں سنبھل گئیں۔ ہفتہ بھر ہم یہاں اس طرح رہے کہ ہوٹل کا کمرہ ہمیں اپنے گھر کی طرح لگنے لگا۔ مسجد سے دوری کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا کیونکہ کھڑکی سے باہر نظر ڈالتے ہی پوری مسجد نبوی اور گنبد خضرا کا براہ راست نظارہ سامنے رہتا تھا۔ اس کے بعد الحمد للہ اتنی ہمت ہوگئی کہ عصر سے عشا تک تیز اے سی کی ٹھنڈ برداشت کر کے مسجد میں بیٹھا رہتا۔ ریاض الجنۃ میں متعدد دفعہ نوافل کا موقع ملا۔ بلکہ وہ دلی خواہش بھی پوری ہوئی جو سن 88 کے بعد کبھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے تھے، اس منبر مبارک پر آپ کے مبارک قدموں کے نشان پر سر رکھ کر نماز ادا کرنا۔ آخری دن بھائی صاحب نے مجھے بتایا کہ ہوٹل کے مالک نے جو بھائی کے جاننے والے تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے، انہوں نے ان سے ہوٹل کا کرایہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ گرچہ ہم نے انھیں کرایہ دیا لیکن یہ اصل اور مقررہ مہنگے کرائے سے کافی کم تھا۔

بازار اور خریدار

سعودی عرب ٹیکس فری ملک ہے جہاں چیزیں اچھی اور سستی ملتی ہیں۔ پھر سالانہ لاکھوں لوگ یہاں آتے ہیں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ یہ شاپنگ کا بھی ایک بڑا مرکز ہے۔ مسجد نبوی کے مرکزی گیٹ کے سامنے واقع ہوٹلوں کے نیچے کئی منزلہ شاپنگ سنٹر بنے ہوئے ہیں جہاں دنیا بھر کی چیزیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ مسجد سے باہر جگہ جگہ ٹھیلوں اور اسٹالوں پر بھی لوگ چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچتے ہیں۔ میری اہلیہ اور بہن کو بھی کچھ ضروری شاپنگ کرنا تھی۔ تاہم میں نے گھر کی خواتین کے ساتھ شاپنگ پر جانے کے بجائے ترجیح اس بات کو دی کہ میں یوسف کو ساتھ لے

کر کمرے میں انتظار کروں۔

شاپنگ سنٹر دنیا بھر میں جہاں بھی ہوں، لوگوں کے لیے بڑے باعث کشش ہوتے ہیں۔ خاص کر آپ کی جیب میں خریداری کے لیے پیسے بھی ہوں تو پھر کیا کہنے۔ میں مدینہ میں قیام کے دوران میں یہ سوچتا رہا کہ مدینہ کے زائرین کو معلوم نہیں کہ یہاں ایک بازار اور بھی لگا ہوا ہے۔ یہ جنت کا بازار ہے۔ اس کے پہلے خریدار ساکنانِ بقیع یعنی صحابہ کرام تھے جنھوں نے جنت کی حقیقی قیمت ادا کی تھی۔ یعنی اپنی جان، مال اور زندگی خدا کی نذر کردی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ سودا (التوبہ 111:9) کرلیا تھا کہ اس کے بدلے انہیں جنت عطا کردی۔ آج ہمارے جیسے نادان ہفتہ بھر کی بے روح عبادت سے یہ سودا خریدنے مدینہ آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ جنت کی قیمت نہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص اس ناقص عبادت اور کمزور عزم کے ساتھ برادران یوسف کی وہی دل شکستگی ساتھ لے آئے، جس کا ذکر پیچھے ہوا اور اسی بے کسی کے ساتھ کہے کہ اے کریم بادشاہ! ہم اپنی ناقص پونجی اور کھوٹے سکے لے کر جنت جیسی قیمتی چیز کو خریدنے آگئے ہیں۔ ہم اپنا مفلس دل اور اپنی بے مقصد زندگی بیچنے آئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی تمام تر بے وقعتی کے باوجود ایسے لوگ اس بازار سے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹ سکتے۔ یہ دنیا کا وہ بازار نہیں جس کے بارے میں شاعر نے کہا تھا:

کب لگاتا ہے کوئی اس دل بے حال کا مول
سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

یہاں تو سب سے قیمتی چیز دل ہوتی ہے.....ٹوٹا ہوا دل۔ میں نے کبھی لکھا تھا اور پھر دہرا دیتا ہوں کہ لوگ ٹوٹی ہوئی چیزیں پھینک دیتے ہیں۔ خدا کے نزدیک سب سے قیمتی چیز یہی شکستہ دل ہوتا ہے۔ مگر کیسا عجیب ہے یہ بازار جس کے وجود سے مدینہ کے بیشتر زائرین نہ

واقف ہیں نہ اس میں خریداری کا طریقہ ہی جانتے ہیں۔

صحابہ کرام کی عظمت اور مدینے کو سرخ سلام

مدینہ نبی کا شہر ہے۔ اسی حوالے سے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مدینۃ النبی ہے۔ نہ عظمت مدینہ میں کوئی کلام نہ مصطفیٰ کی عظمت میں کوئی شک ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں نے پیچھے عرض کیا ہے کہ آپ تو اپنی سچائی کے وہ زندہ معجزے چھوڑ کر گئے ہیں جن کی مثال کبھی ملی ہے اور نہ ملے گی۔ لیکن مدینے کی عظمت کا ایک اور پہلو وہ ہے جسے انجیل میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے جس میں مدینہ کے لیے مقدسوں کی لشکرگاہ (مکاشفہ 9:20) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

یہ قدسیوں کی جماعت بلاشبہ بہترین انسانی گروہ تھا جو نبی آخر الزماں کا ساتھ دینے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی انہوں نے حق کو اس وقت قبول کیا جب اس کے ساتھ کوئی ظاہری عظمت جمع نہیں ہوئی تھی۔ یہ حق ایک ایسی ہستی کی طرف سے سامنے آیا تھا جو مکہ کی گلیوں میں چلنے والے ایک عام آدمی تھے۔ اس حق کے ساتھ نہ مادی طاقت تھی نہ اقتدار کی عظمت، نہ دنیوی سامان تھا اور نہ سماج میں مقام ملنے کا کوئی امکان تھا۔ سب سے بڑھ کر اس حق کو قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ صدیوں سے قائم باپ دادا کے دین اور اسلاف کی روایت کے خلاف بغاوت کردی جائے اور اس کے نتیجے میں وقت کے فرعونوں کی مخالفت اور ایذارسانی کے سامنے کے لیے تیار رہا جائے۔ ان کے پیچھے وہ ماضی تھا جس میں اپنے آبائی دین کے تعصّبات تھے، سامنے وہ حال تھا جس میں قبول حق کا مطلب بدترین ظلم وستم کو آواز دینا تھا۔ مگر انہوں نے نبی کی دلیل کو دیکھا اور اس کے وعدہ فردا پر بن دیکھے ایمان لے آئے۔ یہ وعدہ فردا مستقبل کی جنت کا وعدہ بھی تھا اور دنیا میں ملنے والے اس غلبے کا بھی جو رسولوں کے ساتھیوں کو ملا کرتا ہے اور جس کی کچھ تفصیل میں نے سفر مدینہ کے آغاز میں کی ہے۔

صحابہ کرام کی عظمت کے یہ وہ پہلو ہیں جن کی بنا پر وہ اس اعزاز کہ حقدار ہوئے کہ رب العالمین اپنے آخری کلام میں ان کی توصیف کر کے اور ان کی عظمت پر اپنی شہادت دے کر انہیں امر کر دے۔ تاہم میرے نزدیک صحابہ کرام کی عظمت کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آبائی دین اور اسلاف کی روایت پر دلیل کو ترجیح دی اور پھر دلیل کی بنیاد پر جو سچائی قبول کی اس پر قائم رہنے کے لیے ہر قیمت ادا کی۔ اپنے آبائی اور پیدائشی تعصّبات کو چھوڑنا کتنا مشکل اور اپنے بنے بنائے ذہنی سانچے کی عمارت ڈھا کر دلیل پر مبنی ایک نئی عمارت تعمیر کرنا کیسا جوکھم کا کام ہے، اس کا اندازہ ایک لطیفے سے کیجیے۔

ایک صاحب کی ساری زندگی کمیونسٹ زاویہ فکر کے تحت گزری تھی۔ مگر جب سوویت یونین کا زوال ہوا اور کمیونزم کے غبارے سے ہوا نکل گئی تو دیگر کمیونسٹوں کی طرح انہوں نے بھی کسی اور نظریے کی پناہ تلاش کرنا چاہی۔ وہ تصوف سے متاثر ہو گئے۔ اسی اثنا میں انہیں مدینہ حاضری کا موقعہ ملا تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا۔ مدینے کی عظمت کو سرخ سلام۔

آج بھی مسلمانوں میں حال یہ ہے کہ جس فرقہ پر پیدا ہو گئے، جس عالم سے پہلی دفعہ متاثر ہو گئے، جس گروہ کے ساتھ وابستہ ہو گئے، زندگی بھر اس کو نہیں چھوڑ پاتے۔ کبھی چھوڑتے بھی ہیں تو اس کی وجہ دلیل نہیں ہوتی بلکہ ذوق اور مزاج ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے ذوق اور مزاج کی بنیاد پر ممکن ہے کہ ایک شخص دیوبندی سے بریلوی یا بریلوی سے اہل حدیث یا سنی سے شیعہ یا شیعہ سے سنی ہو جائے، مگر پروردگار کے نزدیک اصل قدر و قیمت اس ایمان اور اس حق کی ہوتی ہے جو دلیل کی بنیاد پر قبول کیا جائے۔ گرچہ مزاج اور ذوق اور ماحول کی بنا پر بھی انسان نے ایمان قبول کیا تو رائگاں وہ بھی نہیں جاتا۔

جہاں رہیں بندگان خدا کے لیے باعث رحمت بنیے، باعث آزار نہ بنیے۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (21)

دلائل توحید: قدرت

قرآن مجید میں ربوبیت کے ساتھ توحید کی دوسری اہم ترین دلیل قدرت کی بیان ہوئی ہے۔ ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں خود انسانی وجود اور پھر اس وجود کے لیے زمین و آسمان میں نعمتوں کے جو اسباب مہیا کیے گئے ہیں، ان کا تقاضہ ہے کہ انسان ان نعمتوں کے عطا کرنے والے رب کے اعتراف اور شکر میں اپنی زندگی گزارے۔ قدرت کی دلیل ایک دوسرے پہلو سے انسانوں کو اس پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف ایک اللہ کی عبادت اور اطاعت کو اپنی زندگی بنالیں۔ یہ پہلو اس قوت، طاقت، اختیار، غلبہ اور قدرت کا ہے جو اللہ پروردگار عالم کو اس کائنات پر حاصل ہے۔

کائنات پر خدا کے اختیار و اقتدار سے استدلال

انسان ایک اللہ کی عبادت اور بندگی کیوں کرے اور کیوں اسے ہی اپنا رب مانے، قرآن کریم اس بات کو دو بنیادی پہلوؤں سے واضح کرتا ہے۔ ایک پہلو جسے قرآن مجید سامنے لاتا ہے وہ کائنات پر خدا کے اختیار اور اس کے اقتدار کا ہے۔ قرآن کریم یہ واضح کرتا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ وہی ساری مخلوقات کا خالق ہے۔ وہی آسمان و زمین اور ان کے بیچ کی ہر چیز کا مالک ہے۔ ہر شے پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ زمین و آسمان میں ایک ذرہ بھی نہیں جو اس کے علم اور قدرت سے باہر ہو۔ سورج اسی کے حکم سے ڈوبتا اور نکلتا ہے۔ چاند اسی کے فرمان کے مطابق اپنی منزلیں طے کرتا ہے۔ تارے اور درخت اسی کے حکم

کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ یہاں جو بھی ہیں سب اس کے غلام، بندے اور مطیع ہیں۔ کائنات پر اسی کی بادشاہی ہے۔ وہی ہر کسی کا آقا ہے۔ کسی کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تو اللہ ہی اس کی مشکل دور کرتا ہے۔ وہی ہر مضطر و بے قرار کی دادرسی کرنے والا ہے۔ ہر نفع اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر ضرر سے وہی بچاتا ہے۔ ہر تکلیف وہی دور کرتا ہے۔ ہر درد کی دوا اس کے پاس ہے۔ ہر زخم کا مرہم وہ دیتا ہے۔ وہی ہنساتا ہے۔ وہی آنسو پونچھتا ہے۔ وہی دیتا ہے۔ وہی لے سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ زندہ ہے۔ وہ ہر کسی کو زندگی دیتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں قائم ہے۔ اسی کی وجہ سے ہر ایک وجود پاتا ہے۔ زندگی اور موت اسی کے اختیار میں ہے۔

ایک طرف اس کی یہ طاقت ہے تو دوسری طرف اسے کوئی عجز درپیش نہیں۔ وہ ہر ممکنہ کمزوری سے پاک ہے۔ وہ ایسا زندہ ہے جسے موت نہیں آنی۔ وہ ایسا بادشاہ ہے جس کی سلطنت کو کوئی زوال نہیں۔ اسے کبھی کسی کمزوری کا اندیشہ نہیں کہ کسی مددگار کی ضرورت ہو۔ وہ سب سے پہلے تھا۔ اس سے پہلے کوئی نہیں۔ وہ سب کے بعد ہوگا۔ اس کے بعد کوئی نہیں۔ وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔ مگر کوئی نگاہ اس کو نہیں پاسکتی۔ اس کو بیوی کی ضرورت ہے نہ اولاد کی۔ بیٹے کی ضرورت ہے نہ بیٹی کی۔ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ آتی ہے۔ اسے نہ کسی دشمن کا خوف ہے نہ کسی حریف کا کوئی اندیشہ۔ نہ اس کی جنس کا کوئی ہے اور نہ اس کا ہمسر اور مقابل ہی کوئی ہے۔ اس کی معلومات میں کوئی اضافہ کرسکتا ہے نہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کچھ جان سکتا ہے۔ ایک پتہ نہیں گرتا مگر اس کے علم میں ہوتا ہے۔ ایک دانہ نہیں اگتا مگر اس کی اجازت لے کر۔ وہ اس وقت سنتا ہے جب کوئی نہیں سن سکتا۔ وہ اس وقت دیکھ لیتا ہے جب کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ان کی خبر رکھتا ہے جن کی خبر کوئی نہیں رکھ سکتا۔

یہ ہے اللہ۔ تنہا اللہ ۔ پاک اللہ ۔ قادر مطلق ۔ قدیر مطلق ۔ الملک ۔ القدوس ۔ العلی ۔

العظیم۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پھر اس کے سوا اور کون ہے جس کی عبادت کی جائے۔ اس کے سوا کون ہے جس کی اطاعت کی جائے۔ اس کے سوا کون ہے جس کے آگے گڑگڑایا جائے۔ اس کے سوا کون ہے جس کے سامنے رکوع و سجود کیے جائیں۔

غیر اللہ اور معبودان باطل کا عجز

قرآن کریم اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ اس ایک ایک جھوٹے معبود کو لیتا ہے جسے انسانوں نے اپنی پرستش کا موضوع بنایا ہوتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ ہیں تمھارے معبود۔ جو فرشتے ہیں تو خدا کے ادنیٰ اور حقیر غلاموں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ خدا کی مرضی اور اذن کے بغیر وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔ وہ اگر جن ہیں تو ان کی حیثیت خدا کی ایک مخلوق سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ اپنے وجود اور اپنی ہر ضرورت لیے خدا کی نظر کرم کے محتاج ہیں۔ وہ تمھارے وفات شدہ بزرگ ہیں تو یاد رکھو وہ تمھاری دادرسی کیا کریں گے، ان کو تو کچھ اپنی خبر نہیں۔ یہ نہیں پتہ کہ موت کی جس بے کسی میں وہ جاچکے ہیں اس سے کب اٹھائے جائیں گے۔ انھیں نہ دنیا کی خبر ہے نہ وہ تمھاری کوئی فریاد سن سکتے ہیں۔ وہ اگر بت ہیں تو وہ اپنے اوپر بیٹھی ہوئی مکھی تک نہیں اڑا سکتے اور مکھی ان کے پاس سے کوئی ذرہ بھی اٹھا کر لے جائے تو وہ اسے بھی واپس لینے کی قدرت نہیں رکھتے۔ نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ بول سکتے ہیں، نہ چل سکتے ہیں، نہ پکڑ سکتے ہیں۔ وہ اگر اللہ کے نیک بندے اور پیغمبر ہیں تو وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارا جائے نہ کبھی انھوں نے اس کی تعلیم ہی دی ہے۔ پیدا ہونے والے، کھانا کھانے والے، پانی پینے والے اور آخر کار مر کر دنیا سے رخصت ہوجانے والے انسان تمھارے معبود کیسے ہوسکتے ہیں؟ وہ چاند سورج اور ستارے ہیں تو یہ اجرام فلکی خود خدا کے حکم کی تعمیل میں دوڑے چلے جاتے ہیں۔ ان کی مجال نہیں کہ خدا کے مقرر کردہ راستے سے سرمو انحراف کرسکیں۔ یہ معبود کیسے ہوسکتے ہیں؟

غرض قرآن مجید ایک ایک معبود باطل کو لیتا ہے اور اس کے معبود ہونے کے تصور کے ایسے بخیے ادھیڑتا ہے کہ انسان ذرا بھی اپنے تعصب سے بلند ہو کر سوچے تو کبھی بھی ان کی عبادت کا تصور نہ کرے۔ قرآن مجید غیر اللہ کے عجز ہی کو واضح نہیں کرتا بلکہ شرک کی اس بھونڈی تاویل کو بھی بالکل رد کرتا ہے کہ ان کی بندگی اور عبادت کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ یا ان کی عبادت کرنے سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ قرآن کریم واضح کرتا ہے کہ یہ محض ایک دعویٰ اور ظن و گمان کی پیروی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت اور کوئی دلیل مشرکین کے پاس نہیں۔ اس خاص پہلو پر ہم تفصیلی گفتگو توحید کی تاریخی روایت کی دلیل کے ضمن میں کریں گے جہاں یہ بتایا جائے گا کہ عقل، نقل اور صالحین کی شہادت سب اس کے خلاف کھڑے ہیں کہ کسی نے شرک کی تائید و حمایت یا اس کی تلقین ہی کی ہو۔ یہاں ہم صرف ان تمثیلوں کے پہلوؤں سے اس بات کو زیر بحث لا رہے ہیں جو خدا کی قدرت اور غیر اللہ کے عجز کے حوالے سے قرآن نے شرک کی تردید میں دی ہیں۔

خدا کی قدرت اور غیر اللہ کے عجز کی تمثیلیں

قرآن کریم بڑی خوبصورتی سے اہل عرب کی روزمرہ زندگی اور معمولات سے مثالیں اٹھا کر ان کو بتاتا ہے کہ جب خدا کے بارے میں یہ سچائی ہے کہ سارا اختیار اسی کا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے بالمقابل کسی کے پاس کوئی طاقت اور اختیار نہیں تو پھر غیر اللہ کی عبادت ایک لغو اور لایعنی چیز سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ تم آقا ہو کر اپنے غلاموں کو اپنے برابر نہیں رکھتے جو کہ تمھاری ہی جنس سے ہیں اور تمھارے ہی جیسے انسان ہیں تو خدا بزرگ و برتر کے لیے کیسے ممکن ہے کہ ان مخلوقات کو اپنی خدائی میں حصہ دار بنائے۔ یا پھر قرآن مجید ایک دوسری تمثیل سے یہ سمجھاتا ہے کہ غیر اللہ کو پکارنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی کنویں پر جا کر پانی کو پکارنا شروع کر دے۔ پانی کبھی خود چل کر اس کے پاس نہیں آئے گا۔ قرآن مجید نمرود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ سناتا ہے

جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تو خدا ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا دے۔ یہ سن کر وہ کافر ششدر رہ گیا۔ یہی غیر اللہ کے عجز کا عالم ہے۔ قرآن کریم ان جیسی متعدد عام فہم تمثیلوں اور واقعات کے ذریعے سے یہ بتاتا ہے کہ ساری قدرت اور نفع و ضرر کا سارا اختیار تنہا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور غیر اللہ کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ کیوں کر درست ہے کہ غیر اللہ کی عبادت کی جائے۔ اللہ کی خدائی اور بادشاہی اور عبادت میں کسی اور کو شریک کیا جائے۔ اس کے ساتھ یا اسے چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کی جائے۔

قرآنی بیانات

''اور کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے۔ اس کی شان ان باتوں سے ارفع ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کے لیے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ (البقرہ 2: 116-117)

''بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔ پوچھو، کون اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کر دے مسیح ابن مریم کو، اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان سب کو۔ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کی بادشاہی۔ وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (مائدہ 5:17)

مسیح ابن مریم تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں اور ان کی ماں ایک صداقت شعار بندی تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو، کس طرح ہم ان کے سامنے اپنی آیتیں کھول کر بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھو کہ وہ کس طرح اوندھے ہوئے جا رہے ہیں۔ کہو کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی بندگی کرتے ہو جو تمہارے لیے کسی نقصان اور نفع پر اختیار

نہیں رکھتی اور سننے والا اور جاننے والا تو بس اللہ ہی ہے۔(مائدہ 75-76:5)

رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھیرا ہوا ہے، سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کہو، اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سر پرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے روزی لیتا نہیں ہے؟ کہو، مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرِ تسلیم خم کردوں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تو بہر حال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اُس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

(انعام 13-18:6)

اور انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں سے آئی جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے،(انعام 100-103:6)

اور اللہ مثال بیان فرماتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا اور اس کی جس کو ہم نے اپنی جانب سے اچھا رزق دے رکھا ہے جس میں سے وہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے، کیا یہ یکساں ہوں گے؟ شکر کا سزاوار اللہ ہے لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور اللہ مثال بیان

کرتا ہے دو شخصوں کی جن میں سے ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، جہاں کہیں بھی وہ اس کو بھیجتا ہے وہ کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا۔ کیا وہ اور وہ جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ ایک سیدھی راہ پر ہے دونوں یکساں ہوں گے؟

(نحل 75-76:16)

وہی (اللہ) دکھاتا ہے تمہیں بجلی جو خوف بھی پیدا کرتی ہے اور امید بھی اور ابھارتا ہے بوجھل بادلوں کو اور بجلی کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے ڈر سے اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھیجتا ہے بجلی کے کڑکے اور ان کو نازل کر دیتا ہے جن پر چاہتا ہے اور وہ خدا کے باب میں جھگڑتے ہی ہوتے ہیں اور وہ بڑی ہی زبردست قوت والا ہے۔

حقیقی پکارنا تو صرف اس کو پکارنا ہے، رہے وہ جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں تو وہ ان کی کوئی بھی دادرسی نہیں کر سکتے۔ ان کو پکارنا ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے درآنحالیکہ وہ کسی طرح اس کے منہ تک پہنچنے والا نہ ہو۔ ان کافروں کی فریاد محض صدا بصحرا ہوگی۔

اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں، خواہ طوعاً خواہ کرہاً۔ اور ان کے سائے بھی صبح اور شام۔ ان سے پوچھو آسمانوں اور زمین کا مالک کون ہے؟ کہہ دو اللہ! ان سے پوچھو تو کیا اس کے بعد تم نے اس کے سوا ایسے کارساز بنا رکھے ہیں جو خود اپنی ذات کے لیے بھی نہ کسی نفع پر کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی ضرر پر۔ ان سے پوچھو، کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے! یا کیا روشنی اور تاریکی دونوں برابر ہو جائے گی! کیا انہوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھہرائے ہیں جنہوں نے اسی کی طرح خلق کیا ہے جس کے سبب سے ان کو اشتباہ لاحق ہو گیا ہے! بتادو کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے اور وہ واحد اور سب پر حاوی ہے۔

(رعد 12-16:13)

کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا، جب کہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشا اور موت دیتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب (مشرق) سے نکالتا ہے تو اسے پچھّم (مغرب) سے نکال دے، تو وہ کافر یہ سن کر بھونچکا رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ (البقرہ 258:2)

آٹھواں اصول: انحراف، حرام، مکروہ اور ضرر سے بچانا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل عیال کو آگ سے۔ (التحریم: ۶)

''اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرو''۔ (طہ: ۲۳۱)

ایک مسلمان اس بات پر حریص ہوتا ہے کہ اپنی ذات اور اپنے گھر والوں میں مطلوبہ اوصاف پیدا کرے۔ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو ممنوعات سے بچائے، ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں فرائض و واجبات اور سنن کے اہتمام پر ضرور دیا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ مکروہات و محرمات سے بچنے پر بھی اتنا ہی زور دیا جائے، مسلمان گھر میں بھی بے حیائی سے بچتا ہے اور گھر سے باہر بھی اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ باہر بھی اس شر سے محفوظ رہے۔ مسلمان گھرانے میں ستر پوشی کا خاص ذوق ہونا چاہیے اور چھوٹے بچوں کے سامنے بھی ستر نہیں کھولنا چاہیے۔

میڈیا کی ہر قسم میں جو لغو اور مکروہ چیزیں دکھائی جاتی ہیں ان سے خود بچنا اور گھر والوں کو بچانا بھی گھر کے سربراہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اچھائی کو جاننے اور اختیار کرنے کی صلاحیت تربیت سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح برائی کو برا جاننے اور ان سے بچنے کا بھی علم ہونا چاہیے۔ کس چیز کو کس پر ترجیح دینا ہے، یہ سب تربیت سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ ایک اور پہلو گھر کی حفاظت کا بھی ہے۔ چوروں سے گھر کی حفاظت کے لیے ضروری ہے گھر کے دروازے بند رکھیں جائیں، گھر میں چولھا اور بجلی سے چلنے والے آلات کی مناسب دیکھ بھال کرتے رہنا چاہیے تاکہ آگ یا شارٹ سرکٹ سے کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے۔ بچوں کے ہاتھ میں دوا یا تیز دھار آلہ مت دیں، یا شیشے کے برتن بھی انھیں نہ دیں۔

[نوٹ یہ سلسلہ مضامین سعید حویٰ کی تصنیف ''البیت المسلم'' کی تلخیص و ترجمہ پر مشتمل ہے]

ترکی کا سفر نامہ (24)

جب بھی کوئی اہم اجتماعی معاملہ پیش آتا تو مسجد میں لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا۔ اس میں عام و خاص، امیر و غریب، چھوٹے اور بڑے یا مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہ ہوا کرتی تھی۔ ہر شخص کو مشورے کی مجلس میں شریک ہونے اور اس میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کی مکمل آزادی ہوا کرتی تھی۔ ایک عام دیہاتی، خلیفہ وقت کے کسی اقدام پر کھلے عام تنقید کر سکتا تھا۔ اپنے نقطہ نظر پر دوسروں کو قائل کر سکتا تھا اور اس طریقے سے اجتماعی عمل میں حصہ لے سکتا تھا۔ اگر کسی شخص کے خیال میں خلیفہ قرآن و سنت کی تشریح غلط کر رہے ہوں، تو وہ ان سے مختلف تشریح پیش کر سکتا تھا۔ اجتماعی فیصلے خلیفہ کی ذاتی رائے پر نہیں بلکہ ارباب مجلس کی اکثریتی رائے کے مطابق ہوا کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز کی صورت میں خلیفہ کو اس بات کا پابند کر دیا گیا کہ وہ عوام کے سامنے حاضر ہو۔ اگر کسی کو خلیفہ سے کسی بات پر اختلاف ہوتا تو وہ دوران خطبہ، خلیفہ کو ٹوک کر اس کا احتساب کر سکتا تھا۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کے واقعات مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے خواتین کے حق مہر کی حد مقرر کرنا چاہی۔ ایک خاتون نے کھڑے ہو کر اس پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا، ''جس حد کو اللہ کے رسول نے مقرر نہیں کیا، آپ یہ حد مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں۔'' آپ نے فرمایا، ''عمر نے غلطی کی اور خاتون نے درست بات کہی۔'' عراق اور شام کی زرخیز زمینوں کے بارے میں آپ کی رائے یہ تھی کہ انہیں حکومتی ملکیت میں رکھا جائے تاکہ ان کی آمدنی کو عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جائے۔ باقی لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اسے فاتح فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کئی دن کی بحث کے بعد سب کو قائل کر لیا۔ آپ نے

اس وقت تک اپنی رائے نافذ نہیں کی جب تک لوگ اس معاملے میں قائل نہ ہو گئے۔

اسلام کی شورائیت کا یہ نظام صرف عرب تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ارد گرد کے علاقوں کی فتح کے بعد ان کے عوام کو مکمل آزادی فراہم کر دی گئی۔

خلافت راشدہ کے دور کے بعد وہ دور آیا جس میں عوام الناس سے یہ حق چھین لیا گیا اور خدا کے نام پر اس کے بندوں کو ایک مخصوص طبقے کا غلام بنا دیا گیا۔ عباسی بادشاہوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انہوں نے سلطان کو ظل اللہ قرار دیا۔ ہمارے ہاں بھی اکبر بادشاہ نے خود کو اللہ کا سایہ قرار دیتے ہوئے خدائی اختیارات استعمال کرنے کا اعلان کیا۔ حکمرانوں کے اس طبقے کو مذہبی راہنماؤں کی حمایت حاصل رہی۔ اس کے بدلے حکمران مذہبی راہنماؤں کو انتظامیہ اور عدلیہ میں ملازمتیں فراہم کیا کرتے تھے۔ قرآن و سنت کی تشریح پر ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ اگر بادشاہ کا جھکاؤ کسی مخصوص فرقے کی جانب ہوتا تو دیگر فرقوں کے افراد کے لئے زندگی تنگ کر دی جاتی۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس سب تنگ نظری کے باوجود مسلم دنیا میں اظہار رائے کی آزادی باقی دنیا کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ تھی۔

یہ مسئلہ صرف ہمارے ہاں ہی نہیں تھا بلکہ اس دور کے یورپ میں بھی یہی صورت حال تھی۔ مسلم دنیا میں مذہبی راہنماؤں کی کوئی باقاعدہ تنظیم موجود نہ تھی مگر اس کے برعکس یورپ میں کلیسا کی صورت میں ایک مضبوط تنظیم تھی جس کا سربراہ پوپ کہلاتا تھا۔ ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک مذہبی معاملات میں پوپ کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ بادشاہوں کی تقرری بھی پوپ کے ہاتھوں ہوتی۔ کسی معاملے میں پوپ سے اختلاف رائے کا ذرہ برابر تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ ایسا کرنے والے کو زندہ جلانے کی سزا سنائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ پوپ سے اختلاف رکھنے والے بالعموم مسلم دنیا میں آ کر پناہ لیا کرتے تھے۔

سولہویں سے اٹھارہویں صدی کے درمیان یورپ میں ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اہل یورپ کا ذہین طبقہ سائنسی اور سماجی علوم کی طرف مائل ہوا۔ انہوں نے مسلم دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں سے علم حاصل کیا اور اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے کرنا شروع کیے۔ اس کے بعد انہوں نے اس میں اضافے کرنا شروع کیے۔ ان کے ہاں Renaissance اور Enlightenment کی تحریکیں چلیں جس میں عوام الناس کی فکری اور ذہنی سطح بلند ہوئی۔ اب انہیں فکری غلام بنا کر رکھنا ممکن نہ رہا۔

جدید سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں بہت سے ایسے تصورات غلط ثابت ہوئے جنہیں اہل کلیسا نے مذہب کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب پر لوگوں کا اعتماد اٹھنے لگا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اہل کلیسا نے انتہا درجے کے ریاستی جبر و تشدد کا سہارا لیا جس کے نتیجے میں لوگوں میں کلیسا کے خلاف بغاوت کی صورتحال پیدا ہوئی۔ پروٹسٹنٹ اور کچھ اور فرقوں نے بذات خود مذہبی نظام میں اصلاحات کرنے کی کوشش کی۔

یہ صورتحال تین سو برس تک برقرار رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل یورپ نے فیصلہ کر لیا کہ مذہب اور سیاست کو الگ کر دیا جائے۔ حکومت کے اجتماعی فیصلوں میں مذہب کا کوئی کردار نہ ہو۔ مذہب کو ذاتی زندگی تک محدود کر دیا جائے۔ جو اسے مان کر اس پر عمل کرنا چاہے، ضرور کرے مگر اسے اجتماعی قوانین کی صورت میں ریاست کی قوت سے نافذ نہ کیا جائے۔ اس تصور کو سیکولرازم کا نام دیا گیا۔ لفظ سیکولر کا معنی ہے ''دنیاوی''۔ سیکولرازم ایسا نظام ہے جس میں اجتماعی دنیاوی معاملات میں مذہب کی مداخلت برداشت نہیں کی جاتی بلکہ تمام دنیاوی قانون خالصتاً دنیاوی طور پر بنائے جاتے ہیں۔

ترکی یورپ کے قریب واقع ہے۔ اس دور میں بہت سے یورپی ممالک عثمانی سلطنت کا حصہ تھے۔ عثمانیوں کے زوال کے دور میں ''ینگ ترکس'' نامی تحریک بڑے عرصے سے کام کر رہی تھی۔ یہ تحریک جدید یورپی تصورات سے متاثر تھی جس میں سیکولرازم اور نیشنلزم شامل تھے۔ مصطفیٰ کمال کا تعلق بھی اسی تحریک سے تھا۔ جب انہیں حکومت کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے سیکولرازم کو جبراً ترکی پر نافذ کرنے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمانوں کی کوئی ریاست سیکولر ہو سکتی ہے؟ اس معاملے میں اسلام کا حکم کیا ہے؟ اس معاملے میں بعض لوگ سیکولرازم کی مکمل نفی کرتے ہیں اور اسے خدا کے خلاف بغاوت قرار دیتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ اسلام اور سیکولرازم کو ہم آہنگ قرار دیتے ہیں۔

اگر کوئی شخص لادین ہو یا کسی ایسے مذہب پر یقین رکھتا ہو جس میں اجتماعی احکام نہ پائے جاتے ہوں تو وہ با آسانی خود کو سیکولر قرار دے سکتا ہے لیکن ایک شخص کا خود کو بیک وقت مسلمان اور سیکولر قرار دینا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میں ایک سیکولر مسلمان ہوں تو گویا وہ اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے: ''یا اللہ! میں تیرا بندہ ہوں۔ میں انفرادی زندگی میں تیرے ہر حکم پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں البتہ اجتماعی زندگی میں میں تیرے کسی حکم کی پابندی نہیں کروں گا۔ اگر میری حکومت کوئی ایسا قانون بنائے گی جو تیرے حکم کے خلاف ہو گا تو میں تیرا حکم ہرگز نہیں مانوں گا'' یہ سیکولر مسلمان کی زندگی میں پیدا ہو جانے والا ایک ایسا تضاد ہے جس کا کوئی حل ممکن نہیں ہے۔ اگر خود کو سیکولر مسلمان کہنے والے کوئی صاحب اس تضاد کا حل پیش کر سکیں تو مجھے خوشی ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ بیک وقت ایک اچھا سیکولر انسان اور ایک اچھا مسلمان بننا ممکن نہیں ہے۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

غزل

شکستہ ساز ہو آواز رکھنا
تم اپنا بھی کوئی انداز رکھنا

مسافت کٹ ہی جائے گی کسی دن
پروں میں طاقتِ پرواز رکھنا

اڑانوں کے سفر پر جب چلو تو
توانا پر، نظر کو باز رکھنا

بڑا مشکل سفر ہے زندگی کا
کوئی ساتھی، کوئی دم ساز رکھنا

اکیلے فرد کی سنتا ہے کوئی؟
زمانے بھر کو ہم آواز رکھنا

مسلسل رابطے میں رب سے رہنا
اسی کو محرم و ہم راز رکھنا

دُکھانا دِل ہے اس بستی کا شیوہ
حنا اس کو نظر انداز رکھنا

☆☆☆☆☆☆☆

دنیا پرستی اور خدا پرستی کا فرق

’’لوگوں کے لیے یہ مرغوبات نفس......عورتیں،اولاد،سونے چاندی کے ڈھیر،چیدہ گھوڑے،مویشی اور زرعی زمینیں...... بڑی خوش نما بنادی گئی ہیں،مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔

حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے،وہ تو اللہ کے پاس ہے۔کہو:میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں،ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں،جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی،وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے،پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویّے پر گہری نظر رکھتا ہے۔یہ وہ لوگ ہیں،جو کہتے ہیں کہ ’مالک!ہم ایمان لائے،ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچالے‘

یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں،راستباز ہیں،فرمانبردار ہیں،اور راہ خدا میں خرچ کرنے والے ہیں،اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت چاہنے والے ہیں۔‘‘

(آل عمران3:17-14)

حدیث:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا ہے،جس کے بارے میں کسی کان نے نہیں سنا ہے اور نہ کوئی انسان کبھی اس کا تصور کر سکا ہے۔تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو’’پھر جیسا کچھ آنکھ کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں،ان کے لیے چھپا کر رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے‘‘۔(السجدہ32:17)(بخاری،مسلم)